انٹرویو: عرفان احمد

''میری علمی ومطالعاتی زندگی''

[ڈاکٹر طاہر مسعود سے انٹرویو]

میں 1957ء میں سابق مشرقی پاکستان کے شہر راج شاہی میں پیدا ہوا۔ میرے والد صاحب کتابوں کے تاجر تھے۔ راج شاہی میں اُن کی کتابوں کی تقریباً تین دکانیں تھیں۔ میں نے جب سکول جانا شروع کیا تو میرے راستے میں ہی ہماری کتابوں کی دکان تھی۔ اُس کا نام اُردو لائبریری تھا تو میں سکول کی واپسی پر اُس دکان میں ٹھہرتا تھا۔ اُس کے پچھلے حصے میں ایک میز پر کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ اُس پر بیٹھ جاتا تھا اور کتابیں نکال کے اُن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ تو اُس زمانے میں وہاں رسائل بھی آتے تھے، اخبارات بھی آتے تھے۔ اردو ڈائجسٹ کی بڑی شہرت تھی۔ اُس کا مطالعہ کرتا تھا۔ پھر وہ ادبی رسائل جن میں نقوش وغیرہ اس طرح کے رسائل وغیرہ آتے تھے، اُن کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اردو کا جو داستانی ادب ہے جیسے طلسم ہوشربا وغیرہ تو اُن کا مطالعہ میں نے اُسی لائبریری میں کیا تھا۔ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا وہاں پہ، تو اُس سے یہ ہوا کہ میری اردو بہت اچھی ہوگئی۔ اسکول میں بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ جب میں نویں جماعت میں تھا تو دسویں جماعت میں طالب علموں کو شرمندہ کرنے کے لیے اردو کے استاد نے کسی لفظ کے معنی پوچھنے ہوتے تھے تو وہ مجھے بلاتے تھے۔ مجھے بُلا کے پوچھتے تھے کہ بتاؤ ان کو۔ تو اُسی اسکول سے میں نے میٹرک کیا۔ پھر جب وہاں ہنگامے شروع ہوئے تو جولائی 1971ء میں ہی ہمارا گھر نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بڑی مشکل سے ہماری جان بچی۔ 1971ء میں ہم کراچی آ گئے۔ یہاں جامعہ ملیہ کالج سے جو ڈاکٹر محمود حسین صاحب کا قائم کردہ تھا، انٹرمیڈیٹ کیا اور پھر اُس کے بعد میں نے آنرز اور ایم اے کی تعلیم جامعہ کراچی سے حاصل کی۔

ہمارے والدین مہاجر تھے۔ میرے دادا ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ ویسے مجھے گلہ ہی رہا کہ سکول کے زمانے میں مجھے کوئی ایسا استاد نہیں ملا جو مجھے پڑھنے لکھنے کی طرف لائے۔ یہ جو کچھ میں نے پڑھا، اپنے شوق سے، کتابوں کے ملنے کی وجہ سے۔ چونکہ گھر میں کتابیں آتی تھیں، رسائل آتے تھے تو اُن کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔

کالج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے وحید اللہ نظمی صاحب جو سیاسیات کے استاد تھے اور ایک پروفیسر عطاء اللہ حسینی صاحب جو اسلامک اسٹڈیز کے استاد تھے۔ ان اساتذہ سے میں کافی متاثر رہا۔ یہ وسیع المطالعہ لوگ تھے۔ ان کے پاس

لائبریری بھی اچھی تھی۔ عطاء اللہ حسینی کالج میں ہی رہائش پذیر تھے۔ میں اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ اُن کے گھر میں ایک اچھی خاصی لائبریری تھی۔ کتابیں بڑی ترتیب اور سلیقے سے سجی ہوتی تھیں۔ میں اُن سے کتابیں لیتا تھا۔ باقاعدگی سے جایا کرتا تھا، کیونکہ کالج میں اُس زمانے میں ہنگامے بہت زیادہ ہوتے تھے تو میں اُس وقت لائبریری چلا جایا کرتا تھا اور لائبریری میں بیٹھ کر وہاں کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

میرا رجحان زیادہ تر ادب کی طرف تھا اور میری مطالعاتی زندگی کی ابتدا بھی ادب ہی سے ہوئی تھی۔ اُس میں خاص طور پر افسانے (Short stories)۔ ناولوں کا بھی بڑا مطالعہ کیا، مثال کے طور پر کرشن، منٹو، بیدی کے افسانے۔ پھر بعد میں آگے چل کر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی کہانیوں نے مجھے بہت Inspire کیا۔ اسکول کے زمانے میں، میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ ایک واقعہ ہے جس کی یاد اب بھی مجھے شرمندہ کرتی ہے۔ لکھنے کا شوق مجھے اسکول کے زمانے سے ہی تھا، لیکن یہ نہیں سمجھ آتا تھا کہ کیا لکھوں تو ایک بہت پرانا رسالہ مجھے اپنی لائبریری سے ملا تو اُس میں ایک کہانی مجھے بہت پسند آئی تو وہ کہانی نکال کر میں نے ایک رسالہ نکلتا تھا ''نقاد''، اُسے تو بھیج دی۔ وہ کہانی اس رسالے نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی۔ نقاد میں پہلے احمد ندیم قاسمی کا افسانہ تھا، پھر میری کہانی تھی۔ اب جب چھپ کر رسالہ آیا تو مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ جس رسالے سے میں نے بھیجا ہے، اب اگر کسی کی نظر اس پر پڑ گئی تو کیا ہوگا اور اگر میری چوری پکڑی گئی تو میرا حشر کیا ہوگا؟ میں اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُس زمانے میں میری بڑی واہ واہ ہوگئی کہ اس کا افسانہ چھپا ہے تو میں نے اُس رسالے کو جس سے افسانہ نقل کیا تھا، اُس کو جلا دیا، لیکن اس سے میرے اندر ایک شرمندگی، ایک غلطی کا احساس پیدا ہوا کہ میں نے یہ غلط کیا ہے اور سوچا کہ مجھے خود لکھنا چاہیے تھا۔

پھر میں نے ایک کہانی لکھی۔ اسی ادارے سے ایک اور رسالہ نکلتا تھا ''آداب عرض''، جس میں سچی کہانیاں چھپتی تھیں۔ اُس میں کہانی لکھ کر بھیجی۔ ہمارے پڑوس میں ہی ایک Love affair ہوا تھا۔ اُس میں کچھ واقعات وغیرہ ایسے تھے جو مجھ تک پہنچے تو میں نے اُس کو ایک افسانوی پیرایے کا رنگ دے دیا اور ''آداب عرض'' میں ارسال کیا۔ اُس سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوا کہ میں خود بھی لکھ سکتا ہوں۔ پھر اُس کے بعد میں نے خود لکھنا شروع کیا۔

اُسی زمانے میں کچھ شاعری پڑھنی شروع کی۔ شاعری پڑھنے کے سلسلے میں واقعہ یہ ہوا کہ میرے چھوٹے چچا تھے جو میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کے پاس ایک چھوٹی سی الماری تھی، اُن میں کتابیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دن میں اُن کی غیر موجودگی میں اُس الماری کو کھول کر وہ کتابیں دیکھ رہا تھا تو اُس میں ایک شعری مجموعہ مجھے ملا ''تلخیاں'' ساحر لدھیانوی کا۔ اُسے جو میں نے پڑھا تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ نظم غزل کے ہر شعر پر میں نہال ہو گیا۔ تو اُس سے مجھے کچھ شعر کہنے کا شوق ہوا۔ پھر میں نے کچھ شعر کہنے شروع کیے اور وہاں ایک شاعر تھے، اُن سے اصلاح بھی لی۔ میں نے مشاعروں میں غزلیں وغیرہ بھی پڑھنی شروع کیں۔ اُس زمانے میں ایک رسالہ نکلتا تھا ''چاند'' اُس میں شاعری کی پیروڈی چھپتی تھی تو اُس طرح کی پیروڈی میں نے بھی لکھ کر بھیجی۔ اس طرح سے لکھنے لکھانے کا شوق پروان چڑھا۔

زمانہ طالب علمی میں مجھے قرۃ العین حیدر کے دو ناولوں نے بہت متاثر کیا۔ اُن میں ایک ''آخر شب کے ہم سفر'' اور دوسرا ''آگ کا دریا'' ہیں۔ اسی طرح میں ''اُداس نسلیں'' سے بھی بہت مُتاثر ہوا اور ایک عزیز احمد کا ناول ''کیسی بلندی کیسی

پستی‘‘، کرشن چندر کا ناول ’’شکست‘‘، اس طرح کے ناول تو میں نے بہت پڑھے، لیکن قرۃ العین حیدر سے میں بہت متاثر ہوا۔ ’’اداس نسلیں‘‘ کے بارے میں کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ عبداللہ حسین نے کردار نقل کیے ہیں قرۃ العین حیدر کے ناولوں سے، جبکہ عبداللہ حسین کا کہنا ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر کو قابل ذکر ناول نگار نہیں سمجھتے۔ لکھنے والا کسی سے متاثر ہوسکتا ہے، مثلاً انتظار حسین نے یہ لکھا کہ میں کرشن چندر سے بہت متاثر تھا اور انہی کے انداز میں لکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا تو ہر لکھنے والے اپنے عہد کے لکھنے والے سے متاثر تو ہوتا ہے۔ ’’اداس نسلیں‘‘ عبداللہ حسین کا پہلا ناول تھا۔ اب اُن کے اور بھی بہت سے ناول آئے ہیں، اب وہ اُس کے اثرات سے نکل آئے ہیں۔ اردو کے اگر دس اچھے ناول چنے جائیں تو پہلا ناول ’’آگ کا دریا‘‘ ہے۔ بعض لوگوں نے امراؤ جان ادا کو اچھا ناول قرار دیا ہے۔ پہلے دس میں عزیز احمد کے ناول، منشی پریم چند، خدیجہ مستور کا ناول ’’آنگن‘‘ بھی آئیں گے۔ فضل احمد کریم فضلی نے ایک ناول ’’خون جگر ہونے تک‘‘ لکھا تھا۔ انہوں نے دو ناول لکھے۔ ایک ’’سحر ہونے تک‘‘، ایک ناول مشرقی پاکستان کے پس منظر میں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو تنقید لکھی گئی ہے، اُس میں اس کا ذکر ذرا کم کم ملتا ہے۔ حیرت ہے کہ نقادوں نے اُن کو نظر انداز کیا۔

اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں نے تکنیک باہر سے لی ہے۔ مثلاً کرشن کے جو افسانے ہیں مثلاً ’’دو فرلانگ لمبی سڑک‘‘ ہے، ’’زندگی کے موڑ پہ‘‘، ’’بالکونی‘‘ اس طرح کے جو افسانے ہیں، وہ بالکل نئی تکنیک میں لکھے گئے ہیں، اس لیے اُن افسانوں نے بہت چونکایا اور پڑھنے والے اور ادبی حلقے بہت متاثر ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ کرشن کا مطالعہ مغربی ادب کا بہت اچھا تھا۔ مغربی فکشن کا انہوں نے بہت مطالعہ کیا تھا۔ یہ ناول، افسانہ یہ ساری اصناف ہی دراصل مغرب سے آئی ہیں۔ شعور کی رو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ورجینیا وولف کے زیر اثر شعور کی رو کی تکنیک میں کہانیاں لکھیں، لیکن قرۃ العین حیدر اس سے انکار کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے جب یہ لکھا، تب میں نے ورجینیا وولف کو نہیں پڑھا تھا اور اپنے طور پر میں نے یہ چیزیں لکھی تھیں۔ اس حد تک ٹھیک ہے کہ بعض تکنیکیں مغرب سے آئی ہیں، لیکن یہ کہ سارے کا سارا سرقہ ہے، یہ غلط ہے۔ یہ طبع زاد افسانے ہیں، اُن کے موضوعات، اُن کے کردار یہ ساری کی ساری اپنی ہے۔

’’تلخیاں‘‘ کی نظمیں مجھے زبانی یاد ہوگئیں۔ اس کے بعد میں نے غالب کو سکول کے زمانے ہی پڑھا، لیکن جدید شاعروں میں جس نے مجھے متاثر کیا، اُن میں منیر نیازی ہیں۔ منیر نیازی کا شعری مجموعہ ’’جنگل میں دھنک‘‘ جو ہے، اُس میں مجھے اک ایسی جھلک نظر آئی کہ جس کے تناظر میں مجھے دنیا بڑی منفرد نظر آئی۔ میں نے ان کے دوسرے شعری مجموعے بھی پڑھے، لیکن ظاہر سی بات ہے، اس سے میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ فیض سے بڑے شاعر ہیں، اس لیے کہ فیض کے نام میں زیادہ کشش اور زیادہ تاثیر ہے اور وہ منیر نیازی سے بڑے شاعر ہیں، لیکن وہ شعرا جو ہمارے عہد میں تھے، زندہ تھے اور لکھ رہے تھے، اُن میں سے منیر نیازی میں زیادہ طاقت، اُن کی سوچ میں زیادہ انفرادیت نظر آئی۔ ناصر کاظمی کے کلام نے بھی متاثر کیا، احمد مشتاق کی بعض غزلیں بہت اچھی ہیں، لیکن زیادہ تر دلچسپی مغربی فکشن سے، افسانے سے اور ناولوں سے رہی۔ ’’راجہ گدھ‘‘ پر میں نے ایک مضمون بھی لکھا، اس ناول نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو میں کئی دنوں تک بہت ہی Depression کا شکار رہا۔ اُن کے کردار مجھے haunt کرتے

رہے۔ میں نے ''راجہ گدھ'' اپنے تحریر کردہ مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ راجہ گدھ میں جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے، وہ سارے کا سارا اشفاق احمد کا فلسفہ ہے۔ مصنفہ تو اس کی بانو قدسیہ ہیں۔ جیسے رزق کا جو فلسفہ ہے، رزق حرام کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے، اشفاق احمد نے بعض مذاکروں میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ سب کے سب وہی ہیں۔ گویا یہ ناول اشفاق احمد صاحب کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔

کالج لائف تک تو میں ادبی مطالعہ ہی کرتا رہا۔ اُس زمانے میں کتابوں سے دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ اُس زمانے میں پیسے بھی نہیں ہوا کرتے تھے، کتابیں خریدنے کا بڑا مسئلہ رہتا تھا۔ یہاں ایک دکان ہوا کرتی تھی ''کتاب محل''، اس دکان کے مالک قسطوں پر کتابیں دیا کرتے تھے۔ ان سے میں کتابیں خریدتا رہتا تھا کیونکہ مشرقی پاکستان سے کراچی آنے کے بعد معاشی حالات بڑے خراب ہوگئے تھے۔ والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اور جو دوست احباب تھے، وہ بھی اسی طرح معاشی تنگی کا شکار تھے۔ کتابوں کے مطالعے میں ادب کے بعد فلسفے کی کچھ کتابوں سے دلچسپی رہی۔ فلسفہ مجھے ہمیشہ بہت مشکل لگا۔ فلسفیانہ مسائل پر میری گرفت کبھی بھی نہیں ہوسکی اور نفسیات پر بھی کتابیں پڑھتا رہا۔ تاریخ پر کتابیں پڑھتا رہا۔ دراصل میرا منظم مطالعہ کبھی نہیں رہا۔ جو جو چیزیں ہاتھ لگتی گئیں، پڑھتا رہا۔

زمانہ طالب علمی میں جس دینی اسکالر نے متاثر کیا، وہ مولانا مودودی صاحب تھے۔ اُن کی کتابیں میں نے پڑھیں۔ اُن میں جیسے ''خلافت وملوکیت'' ہے۔ بعد میں دوسری کتابیں پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ''خلافت وملوکیت'' میں احتیاط کا دامن چھوڑ دیا گیا ہے اور بہت سی چیزوں کو جس طرح رقم کیا گیا ہے، اگر نہ کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔ اُس کے علاوہ اُن کی دوسری کتابیں جیسے ''سود'' ہے، ''معاشیات اسلام'' ہے، ''اسلام اور جدید معاشی نظریات'' ہے اور ''پردہ'' ہے، وہ ساری کی ساری کتابیں میں نے پڑھیں۔ ان کتابوں نے میرے خیالات کو، میری فکر کو مذہب کی طرف موڑنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور پھر آگے چل کر میں نے جب اُن کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' پڑھی تو اُس سے میرے اندر ایک انقلاب آیا اور یہ داڑھی جو آپ دیکھ رہے ہیں اور نماز کی پابندی، اس میں ''تفہیم القرآن'' کا بہت اہم کردار ہے۔ اس کے پڑھنے سے پہلے دل میں یونہی ایک خیال سا آیا کہ کتابیں بہت پڑھتا رہتا ہوں، لیکن اگر قیامت کے دن اللہ مجھ سے سوال کرے گا کہ ایک کتاب میں نے بھی تمہارے لیے اتاری تھی، تو نے اُسے پڑھا کیوں نہیں تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ اس خیال کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے ''تفہیم القرآن'' کا مطالعہ کرنا چاہیے، قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تو تفہیم کا ایک کمال تو اُس کا ترجمہ ہی ہے جسے انہوں نے قرآن حکیم کی ترجمانی کہا ہے۔ اُس ترجمے کو پڑھنے کے دوران مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ میں اسے پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ تفہیم القرآن کو کہوں گا کہ میری زندگی کا رخ بدلنے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

''تفہیم القران'' سے میرے اندر ذوق پیدا ہوا کہ میں دوسری تفاسیر کو بھی پڑھوں اور پھر میں نے ''تفسیر عثمانی''، مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر ''معارف القرآن''، مولانا امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' پڑھیں۔ اس طرح قرآن فہمی کا ذوق مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن سے پیدا ہوا اور پھر میرا مطالعہ دینی کتابوں کی طرف مڑ گیا اور میں نے دینی کتابیں پڑھیں۔ شکیب ارسلان کی ''اسباب زوال امت''، امیر علی کی ''روح اسلام'' اور دوسری بہت سی دینی

کتابیں پڑھیں۔ پھر مجھ میں تصوف کا ذوق پیدا ہوا تو میں نے تصوف پر بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس میں خاص طور پر مولانا اشرف علی تھانوی کے مواعظ اور دیگر کتابیں شامل ہیں۔ جدید ذہنوں کو متاثر کرنے میں مولانا مودودی کی تحریریں اور قلم بہت متاثر کن ثابت ہوتا ہے، لیکن دین کی اصل تفہیم میں اور دین کے لحاظ سے اعمال کی تربیت میں اور تزکیہ نفس کے عمل میں مولانا کی تحریریں اتنی موثر ثابت نہیں ہوتیں جتنی مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی محمد شفیع صاحب کی تحریریں ثابت ہوتی ہیں۔

سیرت کے حوالے سے شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی جو کتاب ہے، میرے خیال میں شاید اس سے زیادہ اچھی سیرت عربی میں بھی نہ لکھی گئی ہو۔ سیرت پر ایک کتاب جو مجھے بہت اچھی لگی، مولانا وحیدالدین کی ایک کتاب ہے ''پیغمبر انقلاب''۔ سیرت پر چھوٹی سی کتاب ہے جس میں انہوں نے حضورؐ کی حیات طیبہ کو بہت اچھے طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ ''محسن انسانیت'' کو بھی پڑھا ہے۔

ادب میں روسی افسانوی اور ناولوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خاص طور پر ٹامسٹائی، دوستوفیسکی، گورکی، گوگول وغیرہ کی کتابیں زمانہ طالب علمی میں ہی پڑھ ڈالی تھیں۔ طنز و مزاح میں پطرس سے لے کر ابن انشا تک، یوسفی، کرنل محمد خان تک سب کی تحریریں میری نظروں سے گزری ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ پطرس کے بعد اگر کسی نے مجھے متاثر کیا تو ابن انشا نے کیا۔ یوسفی صاحب کی لوگ بہت تعریف کرتے اور بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کے جملے بڑے quote کیے جاتے ہیں، لیکن یوسفی صاحب کا جو مزاح ہے، وہ مجھے بڑی محنت کے بعد بنایا ہوا مزاح لگتا ہے۔ جملہ تراشنے میں وہ بڑی محنت کرتے ہیں، سوچتے ہیں اور سوچ کر مزاحیہ جملہ وضع کرتے ہیں، لیکن ابن انشاء کے اندر بڑی برجستگی ہے اور ان کا مزاح بہت بے ساختہ مزاح ہے۔ ''اردو کی آخری کتاب'' دیکھ لیں یا جواُن کے کالموں کا مجموعہ ہے ''خمار گندم'' یا ''آپ سے کیا پردہ'' وغیرہ، اُن میں جو بات ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور مزاح کے اعتبار سے جو بے ساختہ مسکراہٹ ہے، وہ کسی اور میں نظر نہیں آئی۔

کالموں میں ابن انشا کے کالم مجھے بہت پسند آئے اور عطاء الحق قاسمی کے کالموں کی پہلی کتاب ''روزن دیوار سے'' مجھے بہت اچھی لگی۔ عبدالقادر حسن کا کالموں کا جو مجموعہ ہے، ''غیر سیاسی باتیں'' وہ بھی اچھا ہے۔ جاوید چودھری کے کالم بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ادب کے میدان میں قرۃ العین حیدر کا ہی نام لوں گا اور اُس کے بعد انتظار حسین صاحب کا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں مصنفوں کے موضوعات کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ جیسے ہجرت کا مسئلہ یا اخلاقی اقدار کا مسئلہ، لوگوں کے رویوں کے بدلنے کا مسئلہ ہے۔

بہت سی کتب نے اپنے اپنے وقت میں مجھ پر اثرات مرتب کیے۔ ''خدا کی بستی'' بھی بہت اچھی لگی، یہ شوکت صدیقی کا ناول ہے۔ شوکت صدیقی ہمارے بڑے اہم ناول نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''کیمیا گر'' میں جو پہلی کہانی ہے، وہ بہت طاقت ور اور متاثر کر دینے والی ہے۔

صبح فجر نماز کے بعد اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ گھر میں تو تین اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں، لیکن اپنے شعبے کی لائبریری میں جا کر کچھ دوسرے اخبارات کو دیکھتا ہوں، مثلاً جیسے نوائے وقت، Nation وغیرہ میرے گھر آتا ہے،

جنگ اور ایکسپریس ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری میں جا کر دیکھتا ہوں۔

دوران سفر ہمیشہ ہی ہلکے پھلکے لٹریچر کا مطالعہ کرتا ہوں۔ خاص طور پر افسانے یا سفرنامے میں نے پڑھے ہیں اور مجھے بہت اچھے بھی لگے ہیں۔ ''دھنک پر قدم''، ''سات سمندر پار'' وغیرہ۔ آپ بیتی اور سوانح عمریاں بھی پڑھی ہیں۔ آپ بیتیوں میں سر رضا علی کا ''اعمال نامہ'' بہت اچھی لگی۔ ابھی حال میں ہی میں نے انتظار حسین کی یادداشتیں ''چراغوں کا دھواں'' بھی مجھے پسند آئی اور آپ بیتیوں میں خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی مجھے اس لیے اچھی لگی کیونکہ اُس میں بڑی سچائی ملتی ہے۔ اپنے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں بڑا منافق آدمی ہوں۔ اُس سچائی نے مجھے متاثر کیا۔ ایسی آپ بیتیاں ذرا کم لکھی گئی ہیں جس میں اپنے آپ کو expose کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں روسو کی آپ بیتی ''اعترافات'' کی بڑی شہرت ہے۔ پھر یہ روایت بھی چل نکلی کہ آپ بیتی میں آدمی اپنے بارے میں سچ بولے، جیسے کشور ناہید نے آپ بیتی لکھی ہے ''بری عورت کی کتھا''۔ اُس میں اُس نے اپنے بارے میں اور اپنے معاصرین کے بارے میں بہت زیادہ صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' بہت پسند آئی۔ اُس میں ایسی نثر لکھی گئی تھی جو ہمارے ہاں کم لکھی جاتی ہے۔ اُن کی کتاب ''لوح ایام'' بھی بڑی اچھی کتاب ہے، انقلاب ایران پر بڑی موثر کتاب ہے۔ شیخ منظور الٰہی کی ''دردِل کشا'' بھی بہت اچھی کتاب ہے۔

مطالعہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اگر سنجیدہ تحریروں کا یا علمی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ باقاعدہ نوٹس لیں یعنی منظّم مطالعہ تو اسی کو کہتے ہیں۔ میں جب علمی مطالعہ کرتا ہوں تو ضرورت محسوس کرتا ہوں، نوٹس وغیرہ لے لیتا ہوں، اس لیے کہ پڑھنے کے بعد ساری چیزوں کو ذہن میں رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور پھر اُس کے لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں دوبارہ اُن کو پڑھوں۔ مثلاً علامہ اقبال کے بارے میں، میں نے پڑھا کہ ابن عربی کی کتاب کا تیرہ مرتبہ انہوں نے مطالعہ کیا۔ شمس الرحمان فارقی صاحب نے کہیں لکھا کہ بعض چیزیں میں چار چار، پانچ پانچ مرتبہ پڑھتا ہوں۔ اُس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ تفہیم کی خاطر اور حافظے میں محفوظ رکھنے کے لیے علمی کتابوں کا لوگ کئی بار مطالعہ کرتے تھے۔ نہرو نے اندرا گاندھی کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں انہوں نے لکھا ہے کہ مطالعہ کے بعد اگر وہ آپ کے ذہن میں محفوظ نہیں رہتا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے گھاس کھودنا۔

قرۃ العین حیدر کو پڑھنے کے بعد میری بہت تمنا تھی کہ اُن سے ملوں۔ چنانچہ 1993ء میں جب ہندوستان گیا تو گو کہ میرا یہ علمی سفر تھا، میں اپنے PHD کے مطالعے کے لیے گیا تھا یعنی اپنے تحقیقی مقالے ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' کی تحقیق کے سلسلے میں گیا تو وہاں ایک سیمینار میں بھی شرکت کی، لیکن بعد میں، میں نے اُسے اپنے علمی سفر میں تبدیل کر لیا۔ نہ گھوما پھرا اور نہ کسی سے ملاقات کی، بس لائبریریوں کی خاک چھانتا پھرا۔ ہندوستان کے پانچ چھ شہر گھومے یعنی کلکتہ میں، لکھنو میں گھوما۔ اُس میں دو چیزیں میں نے اپنی خواہش سے کیں۔ ایک تو تاج محل دیکھا اور دوسرا قرۃ العین حیدر سے ملاقات کی۔ ابوالکلام قاسمی جو اردو کے بہت اچھے نقاد ہیں، اس ملاقات میں میرے ہمراہ تھے۔ وہ مجھے قرۃ العین سے ملوانے کے لیے اُن کے فلیٹ میں لے گئے جہاں میں نے اپنی محبوب مصنفہ سے ملاقات کی۔

میری بہت دیرینہ خواہش رہی کہ میں اپنے بچوں کے اندر بھی مطالعے کا ذوق پیدا کروں چنانچہ اُن کو کتابیں

خرید کر دینے کا سلسلہ شروع کیا، لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر دو چیزوں کی وجہ سے مجھے اس کوشش میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور میرے بچے ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر میں جتنی دلچسپی لیتے ہیں، اتنی غیر نصابی کتابوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ مثلاً جب میرے بچے چھوٹے تھے تو میں انہیں کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتا تھا اور جب وہ بڑے ہو گئے اور میں نے اُن کو کہانیاں اور کتابیں دیں اور تلقین کی کہ بھئی ان کو پڑھو تو انہوں نے ان کو پڑھنے کے بجائے ٹیلی ویژن دیکھنے کو ترجیح دی اور اس کا مجھے بڑا قلق ہے کہ میں اپنے بچوں کے اندر وہ ذوق مطالعہ پیدا نہیں کر سکا۔ میری لائبریری میں تقریباً 4 یا 5 ہزار کتابیں ہوں گی اور اب مسئلہ کتابوں کو رکھنے کا ہے۔ جگہ نہیں ہے گھر میں، اس وجہ سے بڑے اختلاف رہتے ہیں۔ بیگم کہتی ہیں کہ گھر میں جگہ نہیں ہے اور آپ کتابوں پہ کتابیں لائے جاتے ہیں۔ رکھیں گے کہاں؟ اس وجہ سے نئی کتابوں کا راستہ رُک گیا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ میں جو میرا کمرہ ہے، اُس میں بھی میرے پاس اچھی خاصی کتابیں ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ کتاب دیکھتے ہی آدمی کا ذوق مطالعہ بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہ کتاب فوراً طلب کر لیتا ہے اور کتاب ایسی چیز ہے کہ جسے تقاضا کیے بغیر لوگ بہت کم لوٹاتے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اگر کتابوں کی واپسی کا تقاضا کریں تو برا مان جاتے ہیں۔ کسی اور چیز کو مانگنے میں تو شاید تکلف ہوتا ہو، لیکن کتاب مانگنے میں کوئی تکلف نہیں کرتا۔ میں اپنے کتب خانے کی طرف یہاں آنے والوں کو ذرا کم ہی لے جاتا ہوں کیونکہ ان میں سے جب کوئی کتاب مانگتا ہے تو دل پہ چھری سی چل جاتی ہے، کیونکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ کتاب واپس نہیں آئے گی۔ میرے کتب خانے سے بہت اچھی اچھی کتابیں چوری ہوئی ہیں۔ مثلاً جب میں دلی گیا تھا تو وہاں سے خشونت سنگھ کا ناول ''دلی'' لے کر آیا تھا انگریزی ورژن۔ اس طرح کافکا کی کتابوں کا ایک ترجمہ لے کر آیا تھا۔ اسی طرح منیر مسعود کی کہانیوں کا مجموعہ، وہ سب کتابیں مجھے یاد ہیں، لیکن وہ میرے کمرے سے غائب ہو گئی ہیں۔

ادبی مطالعے کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس سے زبان سے آشنائی پیدا ہوتی ہے اور انسان زبان کے مختلف اسالیب کے بارے میں سیکھتا ہے اور دوسری بات یہ کہ چیزوں کو دیکھنے کے Perspective میں تبدیلی آتی ہے کہ چیزوں کو کس رنگ میں دیکھنا چاہیے، چیزوں کو کس طرح محسوس کرنا چاہیے۔ بہتر انسان بننے میں ادبی مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ادبی مطالعہ نہ ہو تو انسان کی شخصیت ادھورے پن کا شکار ہو جاتی ہے جب کہ ادبی مطالعے سے آدمی باطنی طور پر بہت Rich ہوتا ہے، بہت زیادہ Cultural Behaviour اُس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر شائستگی آتی ہے اور نتیجتاً وہ بہتر انسان بنتا ہے اور اس کے لیے ادب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے اور آج جتنی بے چینی اور سفاکی آپ کو نظر آتی ہے، جو ایک بے روح مادیت پسندی نظر آتی ہے، اُس کی وجہ بھی میرا خیال یہی ہے کہ لوگ ادب کا مطالعہ نہیں کرتے یا پھر ادب سے اُن کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔

ابھی چند دنوں پہلے کی بات ہے کہ ساقی فاروقی صاحب کی کتاب آئی ''آپ بیتی پاپ بیتی'' اسے پڑھ کر مجھے بہت غصہ آیا، بڑی کراہت محسوس ہوئی اور ایک احساس ہوا کہ کیا کوئی آدمی اس طرح کی بھی باتیں لکھ سکتا ہے۔

باقی زندگی کے لیے تفاسیر اور سیرت کی کتابیں لوں گا۔ فوری طور پر کوئی نام ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔